غلبۂ جذبات

حکیم الامت علامۂ ہندی مولانا سید احمد نقوی مجتہد طاب ثراہ

حیات انسانی کے دو مختلف اجزاء ہیں ایک حیات نباتی دوسرے حیات حیوانی۔ انسانی زندگانی کے تمام افعال انہیں دو اصناف پر منقسم ہیں۔ کھانا، پینا، سونا یہ اول الذکر کی مثالیں ہیں۔ چلنا پھرنا اور ادراک سے کام لینا آخر الذکر کے مظاہر ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ علیٰ ترتیب زمانی کے لحاظ سے اول الذکر کو آخر الذکر پر تقدم ہے۔ دیکھو بدل متحلل کی ضرورت، گرمی، سردی کا احساس، خواب کی احتیاج، یہ چیزیں انسان میں ولادت کے ساتھ ہی پیدا ہو جاتی ہیں۔ خلاف اس کے چلنے پھرنے کی قوت اور قوائے مدرکہ سے کام لینے کی قابلیت ایک مدت میں آتی ہے۔ یہ کیفیت صرف جسمانی زندگی کی نہیں بلکہ ذہنی زندگی کی بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ شعور کے ابتدائی مدارج میں بھی وہی خصائص نقش ظہور پذیر ہوتے ہیں جس کا تعلق احساس سے ہوتا ہے اور اگر خصائص عقلی ظاہر نہیں ہوئے ہیں تو انہیں احساس خصائص کے تابع و مغلوب رہتے ہیں۔ اسی لیئے تم دیکھتے ہو کہ بچوں، عورتوں، وحشیوں کے جذبات کس قدر قوی ہوتے ہیں اور ان کی عقل ان کے جذبات کے سامنے مغلوب و بے بس رہتی ہے۔ مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کاروبار، ارسطو، فیثاغورث، کے وضع کردہ اصول منطق پر نہیں بلکہ طبعی اور خودرو جذبات کی رو پر چل رہا ہے کائنات کی مشینری جس کمانی سے چل رہی ہے وہ جذبات ہی کی قوت ہے۔ جدھر جذبات کی رفتار ہوتی ہے اسی طرف انسان سے افعال اور اعمال سرزد ہوتے ہیں اور جذبات کی نوعیت پر انسان کی سیرت اور کیرکٹر کی تشکیل ہوتی ہے۔ البتہ عقل کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جذبات کے غیر محدود زور و قوت کو ایک حد تک محدود رکھے۔

لہٰذا سیرت انسانی کی کنجی جذبات ہی کے ہاتھ میں ہے اور عقل افسرانہ حیثیت سے ان کی نگراں ہے۔ اور چونکہ عقل ارتقائی حیثیت سے جذبات کے مقابلے میں بہت ہی کم عمر ہے اور خصائص ذہنی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے اس لیئے جہاں شعور اپنے انتہائی نقطۂ کمال سے پست ہوا اور شعور خفی کا دور دورا شروع ہوا وہیں عقل کی باگ فوراً ڈھیلی ہو جاتی ہے اور جذبات تقریباً مطلق العنان ہو جاتے ہیں اور انسان کی حیات نفسی کے ہر شعبے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالت میں کسی کے سامنے اگر چہ وہ جماعت ہی کیوں نہ ہو اس کی عقل کو مخاطب کرنا قطعاً بیکار ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کا مخالف اثر پڑتا ہے۔ اس لیئے علمبرداران اصلاح کو لازم ہے کہ جن عقائد و خیالات کی بنیاد تمامتر جذبات پر ہیں ان کی رد میں دلائل و براہین سے کام نہ لیں اس لیئے کہ جو شی عقل کی راہ سے نہیں آتی ہے وہ عقل کے راستے سے نکل ہی نہیں سکتی۔ جماعت کے خیالات و معتقدات جذبات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور

جذبات ہی انہیں ہٹا سکتے ہیں اور اسی طرح سے تعلیم میں ان جذبات کے مٹانے میں بے بس ہے اور اس کا کام قوت فکری کو جلا دینا ہے۔ تعقل قوی ہوجاتا ہے، استنباط مسائل کا بسہولت ہوتا ہے مختصر یہ ہے کہ عقل اور قوی حصہ کے نقش کے کسی اور شعبہ پر تعلیم وتربیت کا کچھ اثر نہیں ہوتا ہے۔ نخاعی قطعات اس کی دسترس سے باہر ہی رہتے ہیں۔ اگر انسانیت کے بالائی اور سطحی پہلو تعلیم سے چمک اٹھتے ہیں لیکن اندرونی اور دقیق خصائص جو اس کی اصل ہستی کا مایۂ خمیر ہوتے ہیں بدستور جوں کے توں رہتے ہیں۔ ارسطو اور افریقہ کے وحشیوں میں یوں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن جہاں تک جذبات طبعی و احساسات جبلی کا تعلق ہے دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

ماحصل تقریر کا یہ ہے کہ عقل اور تعلیم جذبات کی نامحدودی کو صرف روک سکتی ہے، انکو فنا نہیں کر سکتے۔ وہ اعمال اور افعال جن پر حیات انسانی کا اطلاق ہے وہ تین عنوانات کے تحت میں رکھے جاسکتے ہیں۔

۱۔وہ افعال جو افراد کی صیانت حیات کے لیئے لازمی ہیں جیسے کھانا، پینا، سونا۔

۲۔دوسرا وہ افعال جن سے نوع یا نسل کی بقا مقصود ہوتی ہے مثلاً تاہل، فرائض زوجیت، اولاد کی پرورش وغیرہ

۳۔وہ افعال جن سے ہیئت اجتماعیہ کا قیام اور ترقی وابستہ ہے مثلاً اگر ہم حیاتیات (بایالوجی) کے قوانین سے مدد لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ حیات انسانی میں یہ ہر سہ عناصر بلحاظ مدارج اہمیت ایک خاص ترتیب کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور انہیں فرائض حیات کے مطابق اور متوازی جذبات ہی نفس انسانی میں ودیعت کیئے گئے ہیں تاکہ ان کے تقاضے سے بے چین ہوکر وہ ان فرائض کو بجالائے۔

انسان میں سب سے زیادہ قوی و غالب وہ جذبات ہیں جن سے ان کی حیات شخصی وابستہ ہے یعنی خود غرضانہ جذبات وخواہشات کا نمبر آتا ہے جن پر ان کی اولاد کا وجود اور زندگی منحصر ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر وہ احساسات ہوتے ہیں جن پر حیات عمرانی مشروط ہے اور یہ ترتیب عین فلسفۂ ارتقا کے مطابق ہے۔

خیال کرو ابتدائی تکویل حیات انسانی میں اگر افراد اپنے وجود کو دنیا کی ہرشی پر مقدم نہ سمجھے اور اگر اپنی زندگی کو ہر چیز پر ترجیح نہ دے تو نتیجہ کیا ہوتا۔ یہ ہوتا کہ تنازع للبقاء میں وہ اپنی پوری حفاظت سے غافل ہوکر فنا ہوجاتے اور اس طرح نہ نسل چل سکتی اور ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوسکتی۔

پس چونکہ فطرت کو نسل انسانی قائم رکھنا مدنظر تھا اس لیئے لامحالہ انسان میں جن جذبات کا سب سے پہلے نشوو نما ہوا وہ وہی تھے جن پر اس کے حیات شخصی کا انحصار تھا اور اس کے بعد وہ جن پر ان کی حیات نسلی کا دارومدار تھا۔ اسی طرح چونکہ ہیئت اجتماعیہ ترقی یافتہ صورت میں اس وقت قائم ہوئی جبکہ افراد کا شعور ایک خاص بلند سطح دماغی تک پہنچ چکا تھا اس لیئے جن جذبات پر حیات عمرانی مشروط ہے اس نے سب سے آخر میں نمو پایا۔ پس چونکہ ان مختلف النوع جذبات کے طبقات بہ لحاظ تاریخ تکوین باہم مختلف ہیں اس واسطے اس اختلاف جذبات سے عدل تاریخی کی مطابقت میں ان کی قوت کے مدارج میں مختلف ہیں یعنی جو جذبات

قدیم تر ہیں وہ نظام عصبی میں عمیق ترین طور پر منقش ہو گئے جو جذبات سب سے آخر میں پیدا ہوئے ہیں ان کی قوت ضعیف ترین ہے۔ چنانچہ آج تک جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ بداہتا ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کو سب سے زیادہ اپنی جان عزیز ہوتی ہے، اس کے بعد اولاد پر احباب و شناسا، اور جب ان طبقات میں باہم تصادم ہوتا ہے تو انسان عموماً اسی جذبہ کی پاسداری کرتا ہے جس کے نقوش اس کی فطرت میں سب سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ اولاد کی پرورش و پرادخت کے مصارف کے لیئے احباب کے مال کو ناجائز ذرائع سے اپنے تصرف میں لانا اور قحط کے زمانے میں شدت گرسنگی سے اپنی اولاد کو خود کھا جانا اسی کلیہ کے شواہد ہیں۔

یہ قوانین فطرت خواہ طبعیات و ریاضیات کے متعلق ہوں اور خواہ نفسیات کے اٹل ہونے میں جن کے مقابلے میں بڑی سے بڑی انسانی ہستی ایک ذرے کے برابر بھی قوت نہیں رکھتی مثالاً دو ایک نظائر پیش کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ یہ قوانین فطرت بڑی سے بڑی ہستی سے اس طرح کھیلتے ہیں جیسے ایک وحشی اور بربری جاہل سے۔

سقراط یونانی فلسفہ کے نظام دشمن کا آفتاب علم وفضل و زہد و اتقا میں مشہور آفاق ہے۔ مورخین متفق اللفظ ہیں کہ ان کا قدم کبھی شاہ رہ اخلاق حسنہ سے باہر نہیں بڑھا ہے لیکن جب ''ایسپیا'' زن بازاری کے گرد اس کے حلقہ بگوشوں کا مجمع نظر آتا ہے تو اسی حلقہ میں سقراط بھی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ''ڈیوٹیما'' زن فاحشہ کی خلوت سرا میں جلوہ گر پائے جاتے ہیں اور کبھی ''الکیابڈس'' خوشرو مرد ساقی کے ہاتھ بیتابانہ جام مئے لے کر دکھائی دیتے ہیں۔

انجیلی مسیح ایک وقت بائیں رخسار پر طمانچہ کھا کر داہنے گال کو بھی سیلی کے لیئے پیش کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور دوسرے وقت فرماتے ہیں کہ دو میں صلح کرانے نہیں تلوار چلانے آیا ہوں۔ ایک وقت چوری کی مذمت فرماتے ہیں اور دوسرے وقت کھیتوں کی بالیاں خود ہی شاگردوں کے ساتھ کھاتے نظر آتے ہیں۔ ایک وقت شراب کی ممانعت ہوتی ہے تو دوسرے وقت پانی کے خم پر شراب سازی کا معجزہ دیکھا جاتا ہے۔ اپنی ماں مریم کی یہ کہہ کر تحقیر کی جاتی ہے ''میں کیا جانوں وہ کون ہے''

شری کرشن مہاراج زاہدانہ اولوالعزمی کی زندگی کو دیکھو اور ساتھ ہی نوجوان دوشیزہ لڑکیوں سے عشق و عاشقی کے افسانے تاریخوں میں پڑھو۔ ''گوکل'' کی بود و باش کے زمانہ میں گوالوں کے بچوں کے ساتھ یار باشی اور ''گوپیوں'' کی ہم نشینی و ہم مشربی، اپنے مربی و محسن ''جودھا'' اور نند جی کو ''کنس'' کے قتل کے بعد حکومت ملتے ہی نہایت بے اعتنائی سے مایوس پلٹانا اور تعلیٰ و ترفع سے اپنی فرمانبرداری اور بادشاہی جتا کر دیرینہ تعلقات کا خاتمہ کر دینا۔

غرضیکہ ایسے ایسے تلون مزاجی کے کرشموں سے بڑی بڑی ہستیاں خالی نظر نہیں آتیں۔ آج نئی فطرت کے تمام ساز و سامان لیئے بڑی سے بڑی قابل تعظیم ہستی اپنے جذبات کے آگے اسی طرح سے محصور و ناچار نظر آتی ہے جیسے ایک بربری آفریقہ کا وحشی ـــــ!!

جرمنی ساری دنیا کو تہذیب وتمدن کا درس دینے کا مدعی تھا لیکن یہی جرمنی کا قیصر قہر و غضب کا عفریت بن کر

اٹھتا ہے اور 'تورین' کے قدیم کتبخانہ اور واجب الاحترام دارالعلوم کو چشم زدن میں خاکستر بنا دیتا ہے۔ ''ہیگل'' ہمیشہ دنیائے جرمنی کا ''ڈارون'' مانا گیا ہے لیکن جرمن وار میں وہ شمشیر بکف اپنی قوم کو خون میں نہاتے دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ ''پروفیسر ونٹ'' و ''منسٹر برگ'' نے ساری عمر نفسیات کے مباحث میں صرف کر دی لیکن ۱۸۶۴ء میں اپنی تمام قوت لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت میں صرف کر دی۔ ''اناٹول'' فرانس کا انشاء پردازوں کا امام تھا لیکن دوران جنگ میں اس کی انگلیاں بجائے کاغذ وقلم توپ وتفنگ سے کھیلتی رہتی تھیں۔ ہزاروں نظارے اس بات کے ہیں کہ انسان کیسی ہی بزرگ وقابل و عالم ہستی ہو فطرت کے اس قانون کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

اسی اصول فطرت کو دیکھتے ہوئے خلاق عالم کو ایسے نفوس کی ضرورت ناگزیر ہوئی جو مافوق البشر اور قوانین فطرت سے بالکل بے تعلق ہوں۔ اس کی نبوت و رسالت اور اس کی فرع جلیل امارت کو خلاف فطرت انسانی خلق کیا گیا اور ایک گھرانے سے مخصوص کر دیا۔ تاکہ ایک ہی مزاج عقلی کے تحت میں سب نبوتیں ہوں اور مختلف جذبات کے تحت میں رہ کر نبوتوں میں اختلاف نہ ہو جائے۔

اور چونکہ نبوت و رسالت اصلاح عامہ اور جذبہ محبت واشیاء وہیئت اجتماعی کے قیام کی غرض سے قائم کی گئی ہے اس لیئے گروہ انبیاء ومرسلین میں بطور توارث کے ایک ہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور نظام عصبی میں ان کی اسی طرح سے عمیق نقوش قائم ہو جاتے ہیں جس طرح سے عام شریعت میں نفس پرستی وخودغرضی اور نسلی اغراض مرتسم ہوتے ہیں اور اسی کا نام عصمت ہے کہ تمام جذبات معدوم ہو کر صرف وہی افعال سرزد ہوں جن سے ہیئت اجتماعی کی حفاظت وبقا ہو۔

چنانچہ ہم اس گروہ مقدس میں سب کی نبوتی زندگی کا جائزہ سردست نہیں لے سکتے۔ ہم اسوقت صرف ایک اس نفس مطمئنہ کو پیش کرتے ہیں جو عالم میں عام بشریت کو چیلنج دیتا ہے اور مافوق البشریت خصائل میں اپنی آپ نظیر ہے۔ جو قدسیوں کا سردار اور کروبیوں کا سرتاج، سرخیل شہدا اور نبوت ورسالت کی کڑی اور ختم نبوت کا سراعظم ہے یعنی حسین علیہ السلام روحی لہ الفداء

ان کی ولادت سے لے کر شہادت تک ان کے مضبوط کیرکٹر میں کوئی تلون مزاجی ومتضاد بات نہ ملتی ہے نہ ملے گی۔ تفصیل کا قیام نہیں ہے اجمالاً سنو۔

حسین علیہ السلام آغوش مادر میں اپنی شہادت و واقعات وحوادث کربلا سن کر مرنے کے لیئے اس وقت سے تیاری کر رہے ہیں۔ ان کے پالنے والے ان کی افتاد مزاج سے اسی وقت سے باخبر تھے کہ یہ ہمت اور شجاعت کا دیوتا صبر واستقلال ومظلومیت کا پیکر کسی جبر وتشدد کے سامنے اپنے اصول کی حمایت سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے گا۔ یہ وجود محترم حیات شخصی وحیات نسلی کے غلبہ جذبات سے مغلوب نہ ہو کر حیات جامعہ انسانی پر مر مٹنے کا اس کی فطرت کا نقش اول جذبہ بقاء ہیئت اجتماعی ہے۔ اس لیئے تھپک تھپک کر سلانے میں لوریاں صبر واستقلال، شجاعت ومردانگی کی دی جاتی تھیں۔ بچپنے کے رونے اور ضد پر واقعات کربلا یاد دلا کر چپ کیا جاتا تھا۔ بھوک اور پیاس کے وقت یتیم وفقیر کو سامنے کی جو کی روٹی اٹھا کر دی جاتی ہے اور تین تین روز کی بھوک

پیاس کا بچپنے سے عادی بنایا جا رہا ہے اور دوسروں کو اپنے نفس پر مقدم کرنے کے لیئے ایثار کا سبق پڑھایا جارہا ہے۔

حسین ان افعال و اعمال سے بے اعتنا ہیں جن پر صیانت نفس موقوف ہے بمقابل دوسروں کی صیانت نفس کے۔ اور خودغرضی و نفس پروری کی کوئی جھلک ان کے افعال میں نہ تھی۔ وہ نفسی و نسلی خواہشات و جذبات کو ہمیشہ نوعی اور قومی مفاد پر نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔

اس پیکر عمل نے بتا دیا کہ اصلاح نوعی کے لیئے جان و مال، اولاد و عزیز و اقارب قربان کردینے والی چیزیں ہیں اور یہی ان کا صحیح مصرف ہے۔

ہر وقت اور ہر حال میں غیر متبدل رویہ سے انہوں نے ثابت کردیا کہ حیات انسانی کے ہر دو عنوانات یعنی صیانت حیات اور بقاء نسل، یہ دونوں ہیئت اجتماعیہ کی بقا و اصلاح و حفاظت کی غرض سے انسان پر عائد کی گئی ہیں۔ وہ مسیح انجیلی کی طرح صلیب پر ''ایلی ایلی ما مستقبانی'' چلا چلا کر مشکل سے جان دینے کو اپنے لیئے عار سمجھتے اور عزیز و اقارب بلکہ ششماہیہ بچہ کو بھی اس ہیبتناک قربان گاہ پر چڑھا کر خوشی و مسرت کی جان دیتے ہیں۔

شری کرشن مہاراج ''پرواسیش'' کے بڑے جاتر میں عیش و نشاط کی داد دیتے ہوئے شراب خواری کی ترنگ میں اپنے قریبی رشتہ داروں اور اپنے دوست ''کوروں'' اور اپنے بے شمار لڑکوں اور پوتوں کو بلوائیوں کی طرح قتل عام کرکے بے گور و کفن نعشوں پر بغیر ایک نگاہ غلط انداز ڈالے ہوئے بھی راہی ہوتے ہیں اور خود بھی سوتے ہیں ایک درخت کے نیچے شکاری کے تیر سے زخمی ہوکر دنیا کو الوداع کرتے ہیں ——!!

مگر حسین علیہ السلام یزید اور اس کے ساتھیوں کی شرمخواری و ظلم و استبداد پر احتجاج کرتے ہوئے اور اسکی خودغرضانہ حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیئے اپنے ننھے ننھے بچوں کے ساتھ کربلا کے چٹیل میدان میں آغشتہ بخاک و خون ہوکر بے گور و کفن تین روز تک پڑے رہے۔

''گوتم بدھ'' اور ''سقراط'' اپنی موت کے وقت وعظ و نصیحت کرتے کرتے جان دیتے ہیں تو حسین روز عاشور اپنے متبعین کو اپنے عمل سے ہر مصیبت کا ابدی علاج بتاتے ہیں۔ بھوک و پیاس کی شدت کا اظہار کرنے پر اصول کی مخالفت اور بیعت یزید کے شیطانی مطالبہ کو لاحول پڑھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ ہر ذلت و رسوائی اور بدترین مصائب میں مبتلا ہوکر جان دینے کو اصول کی حفاظت میں ترجیح دیتے ہوئے ''العار اولیٰ من دخول النار'' کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ عار و ننگ کے لیئے جان دیدینا اور رضاء الٰہی کے لیئے موت اور ہر ننگ و عار کو گوارا کر لینا ہی وہ آخری نصیحت ہے جو حسینی زندگی کا ماحصل ہے۔ اور تمام جذبات فاسدہ کا یہی تریاق۔ ہر خوبی کا سرچشمہ اور آخری قطرہ خون کی قوم کو دعوت ہے۔

لہٰذا حسین مظلوم کی صحیح عزاداری و سوگواری اور رونے رلانے میں اگر یہ جذبہ کارفرما نہیں ہے تو بے سود و بے ثمر ہے۔ سچا حسینی وہ ہے کہ خودداری میں مر مٹنے اور خدائے تعالیٰ کی مرضی کی حفاظت میں جان و عزت کچھ بھی عزیز نہ کرے۔